ساقی نامہ

احمد جاوید

Saqi-nama is a sub-genre of Masnavi. Allama Iqbal used this genre in its original technical system and started a tradition by changing its traditional content. Earlier Saqi Nama used to be God-centred, but Allama Iqbal made it human-centered. In other words, Allama Iqbal has described the subjects related to human reality in Saqi Nama. Allama Iqbal has also mentioned the phenomena of nature in Saqi Nama but has given them a new meaning. It seems that in his poetic scenario, the earth has risen from its level and has become heaven. Throughout the poem, Allama Iqbal moves from one major subject to another major subject so skillfully as if the reader moves from one world of meaning to another universal reality without feeling any distance. Each word of Saqi Nama has a universal meaning. In it, we see the inner light of life, the knowledge of reality and the continuous abundance of Divine Love in the universe at every step.

ساقی نامہ مثنوی کی ایک ذیلی صنف ہے اور جو عموماً بہار اور میکدے کے پس منظر میں لکھا جاتا ہے۔ اس کے مضامین عموماً نشاطیہ ہوا کرتے ہیں۔ اقبال نے اس صنف کو اس کے اصل تکنیکی نظام ہی میں استعمال کیا ہے یعنی بہار اور مے خانے کے پس منظر میں لیکن اس کا مے خانہ اور اس کے روایتی مشمول و مافیہ کو بالکل بدل دیا۔ پہلے ساقی نامہ احوالِ وصال کا بیان ہوتا تھا اور عارفانہ مضامین یعنی عاشقانہ ماحول میں عارفانہ مضامین۔ یہ ساقی نامہ تھا نشاطیہ انداز سے۔ اقبال نے اس کے ماحول کو اور اس کے مضامین کو اپنی اصل میں بدل دیا اور وہ کارنامہ یہ ہے کہ ساقی نامہ جو خدا مرکز ہوا کرتا تھا اقبال نے اسے انسان مرکز بنا کے دکھا دیا، یعنی اس کے سارے مضامین حقیقتِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اور مابعد الطبیعیاتی حقائق سے براہِ راست متعلق نہیں ہیں۔ اقبال یہ ایک بنیادی تبدیلی لائے ہیں۔ ساقی نامہ میں جو ساقی ہوتا ہے وہ کبھی

خدا ہوتا ہے اور کبھی سمجھیں جیسے مرشد محبوب ہوتا ہے جو عاشق یا عارف کے تمام مسائل کو حل بھی کرتا ہے اور اس کے سارے سفر کا خود مقصود ہوتا ہے۔ تو ساقی کی اس حیثیت کو اقبال نے برقرار رکھا ہے۔ ساقی نامہ کا آغاز ہی بہاریہ سے ہوتا ہے۔ اس کے پہلے بند کو کہتے ہی بہاریہ ہیں۔ بالکل اسی طرح اقبال نے لکھا ہے:

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار

گو کہ یہ شعر روایتی انداز کا ہے لیکن اس میں دو باتیں نکتے کی ہیں۔ ایک بات یہ کہ محل بیان وادیِ کوہسار کو بنایا ہے۔ شہر وغیرہ کو یا کسی اور مقام کو نہیں بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وادیِ کوہسار کی ایک علامتی معنویت ہے اور یہ یقیناً اقبال کے ذہن میں رہی ہوگی۔ وہ یہ کہ وادی زمین کی پستی کی بھی علامت ہے کیونکہ زمین میں زیادہ گہرائی وہاں ہوتی ہے اور پہاڑ کی موجودگی سے بلندی کا بھی کنایہ ہے۔ تو اس شعر سے وہ جتانا چاہ رہے ہیں کہ میں زمینی مسائل اور آسمانی حقائق کو ایک دوسرے سے جوڑ دوں گا۔ یہ یقیناً اُن کے ذہن میں ہوگا۔ پہلے ہی شعر میں بتا دیا کہ میں جہاں ہوں یعنی زمین اپنی سطح سے بلند ہو کر جنت بن گئی ہے۔ یعنی بہار کا گلزارِ غیب سے ایسا سلسلہ جاری ہو گیا کہ زمین کی حیثیت بلند ہو گئی۔ زمین مٹی کی سطح سے بلند کر جنت کی شادابی کا مظہر بن گئی۔ تو کاروانِ بہار کیا ہے کاروانِ بہار وہ ہے جو گلشنِ غیب سے آ رہا ہے:

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن

اس کا ہم نے بار بار مشاہدہ کیا ہے کہ اقبال ایک بڑے مضمون سے دوسرے بڑے مضمون تک بہت تیزی سے منتقل ہو جاتے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ ایک جہانِ معانی سے دوسرے عالم حقیقت تک کوئی فاصلہ پیدا کیے بغیر منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ یہاں کیا کہ پہلے شعر سے عالم مکان میں رفعت پیدا کر دی۔ یعنی ارم بھی مکان، زمین بھی مکان، دامنِ کوہسار بھی مکانیت کا حامل۔ اب یہاں زمان کی سطح پر بھی ابدیت پیدا کر دی۔ وہاں مکان کی سطح پر لامحدودیت پیدا کی اور یہاں زمین کی سطح پر ابدیت پیدا کی۔ وہ کیسے؟ ''شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن''۔ ازل کے لفظ سے زمان کا استعارہ آ گیا اور دامنِ کوہسار اور ارم سے مکانیت کا استعارہ آیا۔ کہ میں جس زمان و مکان کو سیاق وسباق اور موقع محل بنا کے یہ کہنے چلا ہوں، جو مجھے کہنا ہے وہ زمان اور مکان اللہ کی طرف سے بھیجے گئے کاروانِ بہار کی بدولت اپنے نچلے مراتب سے بلند ہو کر ایک لامحدود دائرہ بنا چکا ہے۔ ''شہیدِ ازل'' کا مطلب ہے اللہ کے پہلے ظہور کو دیکھ کر اس پر فدا ہو

جانے والا۔ ''شہیدِ ازل'' کا ایک لفظی مطلب ہے زمان ومکان سے پہلے اللہ کے ظہورِ جمال کو دیکھنے والا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کے پہلے ہی جمال پر فدا ہو جانے والا۔ تو لالے کی روایت سے فدا ہونا، لالہ خونیں کفن کہہ رہے ہیں۔ تو یہ شہادت گویا مقتول ہونے کے معانی میں ہے۔ تو کہتے ہیں کہ یہاں کا لالہ گویا جمالِ اوّلین پر فدا ہو جانے والا ایک عاشق ہے۔ اب آپ سوچیے کہ اس پورے ماحول کی حیثیت کتنی بدل گئی کہ یہاں کا ہر پھول اللہ کے پہلے جمال کی، پہلی دید کی یاد دلا رہا ہے۔

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

یہ تصویر بن گئی کاروانِ بہار آیا، اس نے دامن کوہسار کو فردوس بنا دیا اور ایسی فردوس جس کا ہر پھول خصوصاً گلِ لالہ جمالِ حقیقی کے پہلے جلوے کی دید اوّل کا مظہر اور علامت ہے۔ اس فضا میں ساری دنیا اُس رنگ کے پردے میں چھپ گئی جس رنگ کو اللہ نے اپنا ذریعہ ظہور بنایا تھا۔ اور لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں۔ کیونکہ پتھر دوری پر قانع ہو گیا، دوری پر راضی ہو گیا تو زندگی سے محروم تھا۔ تو پھر اس کی دوری کو بھی اس وفورِ جمال نے ختم کر دیا۔ تو اس میں زندگی واپس دوڑنے لگی۔ لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں۔ اس میں خوبصورتی دیکھیے کہ رنگ اور لہو میں مناسبت ہے کہہ رہے ہیں کہ جس رنگ ظہور نے، جس رنگِ جمال نے دُنیا کو ڈھانپ رکھا ہے وہی رنگِ جمال پتھر کی رگوں میں دوڑنے والا خون بن گیا ہے۔ کہہ یہ رہے ہیں کہ جس رنگ نے دنیا کو باہر سے ڈھانپ رکھا ہے اسی رنگ نے دنیا کو اندر سے زندہ کر دیا۔ یعنی وہ رنگ ایسا ہے کہ وہ دنیا کے ظاہر اور باطن دونوں پر غالب ہے۔

فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

سبحان اللہ! آفاق اتنا دلکش ہو گیا کہ انفس کو چھوڑنے پر ہم تیار ہو گئے ہیں کہ پرندہ اپنے آشیانے سے مانوس ہوتا ہے اور ضرورت کے بغیر گھونسلے سے نہیں نکلتا۔ تو کہہ رہے ہیں کہ پرندے کو ضرورت کی سطح سے بلند کر کے فضا میں ایسی کشش پیدا ہو گئی ہے کہ پرندہ اپنی ضرورت سے قطع نظر اپنے آشیانے کو چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔ بھائی! یہ بہت بڑی نظم ہے، بڑا جوش ہے اس میں۔ دو معانی ہیں اس کے، کہ جو بھی چیز ہے اپنے موجودہ تعین سے نکلنے پر کمر بستہ ہے۔

تعین کا مطلب ہے کہ میں جیسا ہوں ویسا نہ ہونے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ میں اپنے آپ کو کسی اور سطح پر موجود کرنے کی کشش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ایسی فضا ہے یہ یعنی فضا اس میں جو چیز مجھ سے اوپر ہے وہ

مجھے کھینچ رہی ہے اور دوسرا مطلب وہی ہے جو میں نے عرض کیا کہ اس دنیا کی زندگی کا قاعدہ یہ ہے کہ اندر کی دنیا باہر کی دنیا سے زیادہ بڑی ہے، زیادہ بامعنی ہے اور زیادہ خوبصورت ہے۔ تو ساری فضا میں اللہ کا ایسا فیضان ہوا کہ باہر کی دنیا اندر کی دنیا سے زیادہ بڑی ہوگئی، زیادہ بامعنی ہوگئی، زیادہ خوبصورت ہوگئی تو اللہ کی بنائی ہوئی، اللہ کے جمال سے تشکیل پانے والی یہ بیرونی فضا ایسی ہے جس کی کشش سے میں اپنے دل کی دنیا، اپنے اندر کے جہان کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ دوسری بات بھی اس میں شامل ہے کیونکہ قفس عنصری کا طائر جو ہے وہ قفسِ عنصری کو نہیں چھوڑے گا کیونکہ اس سے باہر کی جو دنیا ہے وہ بہت کم تر ہے اس پنجرے میں موجود دنیا سے۔ دنیا باہر کی ایسی ہوگئی ہے یعنی باہر کی دُنیا کے نقائص کو ختم کرنے کے لیے ہم اپنے اندر جھانکتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے مایوس ہوکر ہم اپنے اندر کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اب باہر ہی کی دنیا اتنی مکمل ہوگئی ہے کہ اب اندر کی دنیا میں جھانکنے کی کوئی خواہش ہی باقی نہیں رہ گئی۔ ''فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور''۔ فضا نیلی نیلی کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسا ظہورِ جمال ہے جس میں اخفا اور غیب گندھا ہوا ہے۔ نیلاہٹ کسے کہتے ہیں جس میں مخفی ہونا بھی شامل ہو۔ نیلاہٹ میں اظہار بھی ہے اور دھندلکا بھی ہے۔ فضا نیلی ہو تو کچھ ظاہر بھی ہے اور کچھ چھپا ہوا بھی ہے۔ تو کہہ رہے ہیں ایسا یہ کاروانِ جمال آیا ہے جس نے غیب اور شہود کو آپس میں گوندھ دیا ہے۔ ''ہوا میں سرور'' کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں ذہن میں نہ آسکیں، ان چیزوں کا تجربہ کروایا جا رہا ہے یعنی ذہن میں نہ آسکنے والے حقائق کا ایک حسی تجربہ کروایا جا رہا ہے میرے چاروں طرف۔ دید میں نہ آسکنے والے حسن کو دکھایا اور نہ دیکھا جا رہا ہے۔ اب یہ الفاظ ہیں:

وہ جوئے کہستاں، اچکتی ہوئی ‏ ‏ ‏ اٹکتی لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی ‏ ‏ ‏ بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

اب آپ کہیں ڈھونڈیے کہ جوئے کہستاں کا ایسا منظر کہاں ملتا ہے۔ پھر ان میں معانی ہیں، معانی تو سبھی میں ہیں۔ حرکت کی کوئی ایسی قسم نہیں ہے جو ان لفظوں سے باہر رہ گئی ہو۔ یہ معانی ہیں کہ یہ جہانِ حرکت ہے۔ حرکت کی کوئی ایسی قسم نہیں ہے جو جوئے کہستاں میں سمٹ نہ آئی ہو۔ ایک معانی یہ ہوگئے اور بُڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی یہ ایک کے بعد دوسری دنیا میں داخل ہوتی جا رہی ہے۔ ہر دنیا اس کے لیے ایک بڑا پیچ ہے تو کاروانِ بہار ایک ایسی طغیانی آئی ہوئی ہے اور نزولِ بہار کی کشش سے کہ وہ جوئے کہستاں گویا اپنے ہر گھماؤ میں ایک نئی دنیا بناتی ہے اور پھر اگلی دنیا میں منتقل ہو جاتی ہے یعنی ظہورِ جمال مجھے کئی کئی عالموں کی سیر کرواتا ہے۔ اُس سیر کا استعارہ جوئے کہستاں ہے کہ وہ خاصیت جوئے کہستاں میں پیدا ہوگئی۔ حرکت کی تمام اقسام اس میں ہوگئیں اور اس وجہ سے اس کی ہر حرکت ایک دنیا بناتی ہے اور دوسری

حرکت دوسری دنیا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

غور کیجیے اس میں کیا کہا گیا ہے؟ یہ دُنیا کو اندر باہر سے بدل رہی ہے۔ سِل کیا ہے دنیا کا خارج اور پہاڑوں کا دل کیا ہے؟ دنیا کا باطن تو اس کا سکون دُنیا کی صورت کو بدل دیتا ہے۔ اس کی حرکت دنیا کے باطن کو منقلب کر دیتی ہے:

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام!
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اب یہ ساقی کی طرف آئے۔ یہاں ساقی گویا ایک محبوب مرشد ہے یا ایک محبوب رہنما ہے یا مظہرِ جمال ہے جو کاروانِ بہار کے اظہارِ جمال کے لیے آیا ہے۔ یہ ساقی اُسی جمال کا مظہر ہے۔ لالہ فام کہا۔ تو گویا یہ اُسی روحِ بہار کا مظہر ہے۔ تو اُسے متوجہ کر رہے ہیں کہ ذرا دیکھ یہ کہ یہ جوئے کہستاں کیا کام کر رہی ہے۔ تو یہ سارے اوصاف بتا کر کہہ رہے ہیں کہ یہ جوئے کہستاں زندگی کا پیغام سنا رہی ہے۔ یہ شعر پڑھنے والے پر فوراً ظاہر کر دیتا ہے کہ اگلے مضامین روایتی نہیں ہوں گے۔ زندگی کا پیغام مطلب ہے کہ دنیاوی زندگی میں درپیش مسائل کا حل بتا رہی ہے:

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

'مئے پردہ سوز' جلا دینے والی شراب۔ کہہ رہے ہیں کہ یہ سب مجھے نظر آ رہا ہے اے ساقی، اب مجھے وہ شراب پلا دے کہ یہ سب مجھے سمجھ میں بھی آنے لگے۔ اس کے اندر جو چیزیں کارفرما ہیں وہ مجھے نظر آنے لگیں۔ یہ جوئے کہستاں بھی ایک پردہ ہے۔ یہ نیلی نیلی فضا بھی ایک پردہ ہے، یہ پردۂ رنگ بھی ایک پردہ ہے۔ مجھے ان پردوں کے پیچھے تک رسائی دینے والی شراب عطا کر دے۔ یہاں ایک دم یہ گریز کیا کہ اتنا بڑا منظر بنایا اور اس کے بعد کہہ رہے ہیں کہ یہ سارا منظر بھی ایک حجاب ہے۔ مجھے تو اس حجاب کے پیچھے جھانکنا ہے۔ کاروانِ بہار جہاں سے چلا ہے اور جہاں تک پہنچے گا مجھے وہ جگہ دیکھنی ہے۔ مجھے ایسی شراب پلا دے کہ میری آنکھ میں وہ بینائی پیدا ہو جائے جو اس پردۂ نورانی کے اُس طرف دیکھ لے۔ تصوف میں ایک جملہ کہا جاتا ہے کہ سخت حجاب اندھیرے کا حجاب نہیں ہوتا۔ سب سے سخت حجاب نور کا ہوتا ہے۔ تو یہ وہی کہہ رہے ہیں، حجابِ نور کے پیچھے دیکھنا چاہ رہے ہیں۔ اس کے لیے ساقی سے مدد اور فیضان طلبی کر

رہے ہیں۔ ''مۓ پردہ سوز'' کا مطلب ہے کہ مجھے روحانی طور پر فیض یاب کر دے۔ میری روحانی قوتوں کو بیدار کر دے تا کہ میری حسی اور ذہنی قوتوں کے نقائص ختم ہو جائیں 'کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز' اس مصرعے کا جواب نہیں ہے کہ ''آتی نہیں فصلِ گل روز روز''۔ کاروانِ بہار روز روز نہیں اُترتا۔ یعنی اللہ کے جمال کا ایسا آفاقی اور انفسی نظام بار بار نہیں چلتا۔ یہ شان بار بار ظاہر نہیں ہوتی یعنی انفس و آفاق میں اس کے جمال کا اظہار بار بار نہیں ہوتا۔ اس بار ہو گیا ہے تو مجھے ظہورِ جمال سے ذاتِ جمال تک پہنچنے والی ایک نگاہ عطا کرنے کا کوئی سامان کر دے۔

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات

ضمیرِ حیات کا روشن ہونا اور مستی کائنات، یہ دو کلیدی الفاظ ہیں۔ حیات کے باطن کی روشنی عرفانِ حقیقت کا نتیجہ ہے اور کائنات کی مستی عشق الٰہیہ کا پھل ہے کہ مجھے تو وہ فیضان چاہیے جو مجھے عارف بھی بنا دے اور عاشق بھی بنا دے۔ وہ ''مے جس سے روشن ضمیرِ کائنات'' کہ وہ فیضانِ الٰہی جس نے زندگی کے باطن میں اپنی نشانی رکھ دی ہے، جس نے زندگی کو اپنی نشانی بنا دیا ہے۔ جس نے زندگی کے باطن میں چھائی ہوئی تاریکی کو اپنے عرفان سے دور کر دیا اور وہی فیضانِ خداوندی جس سے کائنات کے رگ و پے میں حضور اور تمنا کی مستی دوڑ رہی ہے۔ وہ شراب جو مجھے غیب کا شعور عطا کر دے ''وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات'' وہ شراب جو میرے اندر حضور کا ذوق پیدا کر دے۔ یہاں انھوں نے پوری چیز مانگ لی۔ عرفان چاہیے غیب سے تعلق رکھنے کے لیے، عشق چاہیے حضور کا حق ادا کرنے کے لیے۔

وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

مے کا مطلب ہوا فیضانِ سماوی۔ کہ وہی divine inspiration مجھے درکار ہے جو ازل کا سوز و ساز ہے۔ اس کو کھولنا بہت ہی مشکل ہے۔ ''سوز و سازِ ازل'' محسوس کر لیں۔ وہ فیضانِ خداوندی جس نے عشق کو زندگی کی اصل بنایا۔ ''وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل'' وہی فیضان جس نے اپنی معرفت کو وجود کا اُصول بنایا ہے۔ رازِ ازل کھلنا معرفت حاصل ہونا۔ سوز و سازِ ازل کو محسوس کرنا عشق حاصل کرنا ہے۔ 'سوز و ساز' جذبِ عشق کی دو جہتیں ہیں، جو ہرِ عشق کے دو اوصاف ہیں۔ سوز وہ جو فراق کو جھیلنے کے لیے درکار ہے، ساز وہ جو وصال کا حق ادا کرنے کے لیے مطلوب ہو۔ ساز وصال کے لیے ہے، سوز فراق کے لیے ہے۔ تو عشق نام ہے وصال اور فراق کی یکجائی کا۔ عشق نہ وصال سے محروم ہے نہ فراق سے محفوظ ہے۔ کوئی

وصال کی ایسی سطح نہیں ہے جو عاشق کو حاصل نہ ہو۔ فراق کا کوئی عالم ایسا نہیں ہے جس سے عاشق گزر نہ رہا ہو۔ کہ جو حق یعنی اس کا غیب مجھے جدائی پر آمادہ رکھتا ہے اس کا حضور مجھے واصل بنا دیتا ہے اور ازل کا لفظ اس لیے لائے ہیں کہ یہ سب کچھ حقیقتِ تخلیق ہے۔ زمان و مکاں پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ یہ چیزیں ظاہر ہوں۔ زمان و مکاں کی پیدائش عشق کے اظہار اور معرفت کے ظہور کے لیے ہے تو مجھے اس مرکز اصلی پہ پہنچا دے جہاں عشق اور عرفان کا مبدا و منبع ہے۔ اس کو میں دوسری طرح عرض کرتا ہوں۔ ''سوز و سازِ ازل'' اوّلیں لمحۂ ظہور ''سوز و سازِ ازل'' تخمِ ظہور جو ماورائے زمان و مکاں ہے۔ تخمِ ظہور یعنی divorie seed of divine manifestation اور ''رازِ ازل'' تخمِ عرفان ''سوز و سازِ ازل'' اللہ کے ظہور کو بنیاد بنایا گیا، ''رازِ ازل'' اللہ کے غیب کو بنیاد بنایا گیا۔ اللہ کا غیب و حضور دونوں، کہ اللہ نے غیب بھی ازل میں اختیار کیا اور ظہور بھی ازل میں منتخب کیا کہ وہ الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی۔

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے　　　لڑا دے ممولے کو شہباز سے

کتنی حسی تشبیہ دی ہے کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ خواہشیں بہت بڑی ہیں۔ ان سے بہت ہی نچلے درجے کی خواہش پیغمبروں نے کی اور وہ پوری نہیں کی گئی۔ تو یہ سب خواہشیں مجھ سے کون سنے گا۔ تو کہہ رہے ہیں بس تو فکر نہ کر ممولے کو شہباز سے لڑا دے۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ مطلب ممولہ اپنے آپ کو کہہ رہا ہے کہ میری تمنائیں شہباز کی ہیں، میری حیثیت ممولے کی ہے۔ لیکن اے ساقی! تیرے ہاتھ میں سب کچھ ہے تو ممولے کو شہباز سے لڑا کے ممولے کو فاتح بنا سکتا ہے۔ اس میں یہ پوشیدہ ہے کہ تو مجھ ایسے آدمی کی بھی یہ تمنائیں پوری کروا سکتا ہے۔ یعنی مجھے یہ راز دکھا دے کہ میں اسے دیکھ سکوں۔ میں وہاں تک پرواز کر سکوں جہاں شہباز پرواز کرے۔ ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔'' تو ممولے کو اُڑا کر وہاں تک لے جانا پڑے گا جہاں شہباز ہے اور پھر فتح دلا دے۔

یہ اقبال کی مجذوبانی نظم ہے۔ اس میں جگہ جگہ مجذوبیت ہے لیکن کیونکہ ان کا ذہن بھی بڑا تھا اور ان کا جذب بھی بڑا تھا۔ ذہن بڑا تھا تو وہ بار بار دونوں کو متوازن کر لیتے لیکن ایسا کہ اس میں بعض جگہوں پر پڑھنے والا وجد میں آ جاتا ہے۔ ایک تو اس کا آہنگ ایسا ہے اور بعض جگہوں پر بالکل جیسے دل میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ نظم ظاہر ہے بغیر مجذوبانہ وفور کے کہی نہیں جا سکتی۔ لیکن اس نظم کا کمال یہ ہے کہ اس میں جذب کا وفور اور ذہن کی قوت ایک دوسرے کے تکمیلی اجزا ہیں، متوازی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو مغلوب نہیں کرتے۔ اس نظم کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جذب اور ہوش کو ان کی شدت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے دکھایا گیا ہے اور یہ بڑا کمال ہے۔

اس نظم کو تھوڑا سا مجذوب ہونے کی نیت سے پڑھا کریں تا کہ ایک جذب آ جائے۔ اگر آپ اس کو

درست رُخ سے پڑھ رہے ہیں تو یہ نظم زلزلے کی طرح اندر اُترتی ہے۔لیکن اگر آپ اسے نصاب کی طرح پڑھیں گے تو ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ایک درست رُخ پر کھڑے ہوجایئے یعنی جہاں وہ 'میں' کہہ رہے ہیں وہاں وہ 'میں' آپ بن جایئے۔

پہلا بند جس شعر پہ ختم ہوا ہے اس شعر میں ایک بہت ضروری نکتہ اور قابل توجہ ہے۔

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اقبال کہہ رہے ہیں کہ ازلی حقیقت کا سامنا مجھے کروا دے لیکن یہ سامنا اس میں ضم ہونے کے لیے نہیں ہے بلکہ شہبازِ حقیقت کو اس شعور کے ممولے سے لڑا دے یعنی وجود کے ان دو مدارج کو ممتاز اور منفرد اور اپنی جگہ قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے لے آ۔

انسان اور حقیقت، تو یہاں ممولہ وجود کا زمانی اور شعور کا مکانی سانحہ ہے یعنی انسان۔انسان کیا ہے وجود کا زمانی اور شعور کا مکانی مظہر یا اُصول۔تو شعور کے انسانی مرکز کو وجود کے حقیقی مرکز کے مقابل لے آ۔ان دونوں کو الگ الگ موجود رکھتے ہوئے۔اقبال کی اصطلاح میں حقیقت یا حق اسے کہتے ہیں جو ابداعِ ہستی بھی کرے، موجد وجود بھی ہو اور ایجادِ شعور بھی کرے، خالق شعور وہ حقیقت یا حق ایک ایسا اصول ہے جو اصل اشیا ہے، ماہیت اشیا ایجاد کرتا ہے۔اب یہ مشکل جملہ سہی لیکن ٹھیٹ اصطلاحی بیان یہ ہے کہ حقیقت وہ اصل ہے جس سے اُصول صادر ہوتے ہیں۔اُصول ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو اشیا میں عکس ریز تو ہوتے ہیں لیکن کسی شے میں ضم نہیں ہوتے۔اُصول ایسی انفرادیتِ محض کو کہتے ہیں جو کثرت میں ظہور پذیر تو ہوتا ہے لیکن کثرت میں صرف نہیں ہوتا، کثرت کا حصہ نہیں بنتا۔تو اقبال کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی ………… کے ساتھ Principle of the truth کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔راز جب بھی آئے گا تو راز کا مطلب حقیقت ہوگا۔غور فرمایئے کہ یہاں انھوں نے ساقی نامے کی معنوی اُٹھان گویا پکڑ لی ہے، آپ کو تیار کر دیا ہے کہ اب اس کا جو اگلا ڈرامائی در و بست ہے وہ کیا ہوگا۔حقیقت الحقائق اور انسانِ حقیقی کا تقابل۔اب آگے یہ آغاز کر رہے ہیں۔

اب یہ اپنے تاریخی وجود کا اظہار کر رہے ہیں۔جو بھی زمانی وجود ہوگا اس کا سب سے حقیقی وصف تاریخیت ہوگا۔ایک صانع اور ایک حرکت رکھتا ہوگا۔اُس صانع اور حرکت کا تاریخی رنگ سیاسی نہیں تاریخی ہے:

زمانے کے انداز بدلے گئے

اس کی بھی داد دیجیے کیونکہ یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ کیا کہا گیا ہے لیکن کیسے کہا گیا ہے۔اس کو اگر آپ نے محسوس نہ کیا تو کیا کہا گیا ہے کو بھی اپنی گرفت میں نہیں لا سکتے۔اچھا رنگ پیالے کے معانی بدل دیتا ہے اور خراب نقش و نگار اسی پیالے کو دو کوڑی کا بنا دیتا ہے تو شاعری میں کیسے کہا گیا ہے کی حیثیت بہت

زیادہ ہے ''زمانے کے انداز بدلے گئے'' اس ایک مصرعے نے آپ کو بتا دیا کہ اب یہ انسان کے تاریخی سیاق وسباق، انسان کے تاریخی وجود کا بیان ہو رہا ہے۔ تاریخ کی آخری تعریف کیا ہے۔ پہلے یہ دیکھیے کہ اقبال اپنے موضوع سے ہٹ کر بھی اسی طرح کے معارف فراہم کر رہے ہیں جیسے بڑا سرچشمہ صرف پیاس ہی نہیں بجھاتا۔ اس چشمے کی اور بھی خصوصیات ہیں۔ وہ آنکھ کو حلاوت بخشتا ہے، دل کو فرحت بخشتا ہے، جو روح کو ٹھنڈک بخشتا ہے۔ وہ احمق آدمی ہے جو ایک انتہائی خوبصورت فضا میں ابلنے والے چشمے کو صرف پینے کے کام میں لانے کے لیے سمجھے۔ تو اب یہ اپنے معانی جو اُن کے اصلی ہیں وہ تو چل رہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ فیاضی کے ساتھ دوسری حقیقتیں بھی واضح کرتے جا رہے ہیں یعنی بڑے آدمی کا کلام اپنے مرادی معانی کو تو بیان کرتا ہی ہے لیکن مرادی معانی کو بیان کرتے ہوئے کئی ضمنی معانی بھی ایسے لٹاتا چلا جاتا ہے جو اس کے مخاطب کی بہت سی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔ بڑے معانی شعور وادراک کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ بڑا مطلب مرکز بالارادہ اور تخصیص کا حامل ہوتے ہوئے ذہن کے عمومی مطالبات کی بھی تسکین کر دیتا ہے۔ ایک بڑا مطلب ذہن میں یوں نہیں آتا جیسے جیب میں پیسے رکھے جاتے ہیں۔ ایک بڑا مطلب ذہن میں جسم میں روح کی طرح جاتا ہے۔ کتنی سادگی سے کہا ہے 'زمانے کے انداز بدلے گئے۔' یعنی زمانے کی بناوٹ اور انسان کے مرکز میں ہونے کی وجہ سے تاریخی ہے، زمانے کی حرکت میں تبدیلی کا عنصر انسان کی موجودگی سے آیا ہے ورنہ تبدیلی کے کوئی معانی نہیں۔ ایک پہاڑ کے آگے درخت ہرا رہے یا پیلا رہے اُسے کیا معلوم کہ تبدیلی ہے، یہ انسان ہے جس نے تبدیلی کو ثابت کیا۔

''نیا راگ ہے ساز بدلے گئے''

کہہ رہے ہیں کہ یہ صرف صورت میں تغیر نہیں آیا ہوا ہے کہ جیسے میز پہ یہ شیشہ لگا ہوا تھا، شیشے کی جگہ لکڑی رہ گئی ہے۔ تو کہہ رہے ہیں ایسا نہیں ہے کہ میز کرسی بن گئی، کرسی چھت بن گئی۔ اس طرح کی تبدیلیاں نہیں ہیں۔ یہاں شعور وادراک میں بھی تبدیلی ہے وجود وہستی میں بھی تبدیلی ہے، اُصول میں بھی تبدیلی ہے، اُصول کے اظہار میں بھی تبدیلی ہے۔ راگ بھی بدل چکا ہے، ساز بھی بدل چکا ہے۔ یہ صرف ایسی تبدیلی نہیں ہے کہ ایک ہی ساز میں دوسرا راگ شروع ہوگیا۔ ساز بھی بدل چکا ہے مصدر بھی بدل رہا ہے۔ منبع صدور فعلیت بھی بدل رہی ہے۔ اس کو زیادہ سادہ لفظوں میں کہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ کائنات اور انسان کا باطن بھی تبدیلی کی زد میں ہے اور ظاہر بھی۔ راگ کیا ہے، راگ باطن ہے، ساز کیا ہے، ظاہر ہے۔ اس کو جس طرح چاہیں سمجھتے جائیں:

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

یہاں سرمایہ داری کی شقاوت اور اس کی کمینگی کو اس طرح سے ظاہر کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام مغرب جدید کا باطن ہے، مغرب کا اُصولِ ہستی ہے تو مغرب کے باطن کو کارل مارکس نے اس طرح کھنگالا ہے اس طرح چورا ہے پر لا کر ظاہر کر دیا ہے، کہ مغرب کو بنانے والا شیطانی ذہن حیرت میں پڑا ہوا ہے یعنی مغرب کی شیطنت کو اس طرح فاش کیا گیا ہے کہ خالق مغرب شیطان حیرت اور اندیشے اور خوف میں پڑ گیا ہے۔ شیشہ باز کہتے ہیں چمتکار اور طلسمات دکھانے والا۔ شیشہ بازی: ایک ایسا فعل دکھانا جو شعور کو متاثر کر دے لیکن وجود نہ رکھتا ہو۔ یعنی شیشہ بازی دھوکہ بازی کو کہتے ہیں۔ تو کہہ رہے ہیں کہ مغرب میں جو شیطنت ہے وہ کارل مارکس نے آ کر فاش کر دی ہے اور ان لوگوں کو اب چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی۔ ۱۹۱۰ء کے بعد والا ماحول ذہن میں رکھیں جب کارل مارکس نے مغرب کو فکری طور پر بالکل پسپا کر دیا تھا اور ان کے لیے جواب دینا مشکل ہو گیا تھا:

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

یعنی عوام کے اندر اقتدار کی اُمنگ کے ساتھ ساتھ اقتدار کی صلاحیت اتنی شدت سے انقلابِ فرانس اور کارل مارکس کی فکر کے نتیجے میں پیدا ہوئی کہ اب ملوکیت زمین کے لیے قابل نفرت ہو گئی ہے یعنی زمین اب ملوکیت کو پاؤں جمانے کی جگہ نہیں دے رہی:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

کہ سرمایہ داری کا دور کارل مارکس کے رجز سے خوف زدہ ہو کر فنا ہو گیا اور یہ مداری تھا جو ایسی ڈگڈگی پہ انسانوں کو بندر بنا کے نچا رہا تھا۔ اس مداری کو کارل مارکس کی آمد نے موت کے گھاٹ اُتار دیا:

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

کہ اس تحریک کا اثر چین تک پہنچا کہ چین والے افیون کی پینک سے بیدار ہونے لگے وہاں بھی ماؤزے تنگ کی پیدائش کا سامان کارل مارکس کی بدولت ہونے لگا۔ اور ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے کہ ہمالہ کے اردگرد کے خطوں اور تہذیبوں میں بھی کارل مارکس کا وہ اثر پہنچنے لگا جو اس نے سرمایہ داری نظام کے خلاف پیدا کیا تھا اور جمہوریت اور ردِ سرمایہ داری کا رویہ مشرقِ بعید میں، جنوبی ایشیا میں بھی بیدار ہونے لگا۔ ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے کا مطلب یہ ہے کہ ہمالیاتی خطے کی روحِ بیداری کا ظہور ہونے لگا:

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

یہ عالم اسلام ہے۔ عالم اسلام اور مشرقِ وسطیٰ ان سب کو تاریخ میں دیکھتے جائیں کہ عالم اسلام اور مشرقِ وسطیٰ کا دل جیسے دوٹکڑے ہو چکا ہے۔ زمانے کی اس تیغ تغیر نے اس کے دوٹکڑے کیے ہیں۔ اب اس کو ایک نئ تشکیل، تعمیر نو کی ضرورت ہے۔ اب اس کا موسیٰ ایک نئ تجلی کا طالب ہے، وہ تجلی جو طور کو جلائے نہ، طور کو بنا دے۔ مطلب، یہ تبدیلی کی رَواتنی بامعنی، اتنی آفاقی ہے کہ اس میں اب مذہبی روایتیں اللہ کی نصرت، اللہ سے تعلق کی نئ سمت ڈھونڈ رہی ہیں۔ یہ سب ہم پہ صادق آ رہا ہے:

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زُنار پوش

کہ مسلمان جذباتی طور پر تو بڑا توحید پرست ہے، نعرے لگانے، تقریریں کرنے اور اللہ اکبر کی چنگھاڑ بلند کرنے میں تو یہ بہت آگے ہے مگر دل اس کا اب بھی زنار پوش ہے۔ یعنی اس کا جذباتی وجود تو جیسا تیسا توحید سے متعلق ہے لیکن اس کا قلبی وجود اس کا باطنی مرکز شرک سے آلودہ ہے۔ شرک کی قسموں میں ایک وطنیت ہے۔ اوپر انھوں نے مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو بتایا نیچے برصغیر کے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جذباتیت کے انداز میں توحید کو مانتے ہوں گے یا اداکاری کے لیے توحید کو مانتے ہیں لیکن ان کا مرکز وجود اور ان کا مایۂ شعور دونوں مشرکانہ ہیں۔ ان کا اسلوبِ ہستی بھی مشرکانہ ہے۔ یہ کہتے ہیں ہم ہندوستانی ہیں، ہم تورانی ہیں اور ہم لکھنوی ہیں اور ہم لاہوری ہیں اور ان کا اسلوبِ شعور بھی شرک پر استوار ہوا ہے۔ یہ چیزوں کو ان کے زمینی تناظر میں دیکھتے ہیں، ان کی سماوی اصل میں دیکھنے سے قاصر ہیں:

تمدن، تصوف، شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!

یہاں اپنی بات کو مکمل کر دیا کہ صورتِ حال یہ ہے کہ ان کے دین اور ان کی تہذیب کے تمام عناصر و اساطین سب کے سب غیر اسلامی ہیں۔ ان کا دین بھی غیر اسلامی ہے، ان کی تہذیب بھی غیر اسلامی ہے۔ عجم میں صرف ایران نہیں آتا عجم میں توران بھی ہے، عجم میں ہندوستان بھی ہے۔ غیر عرب بس عجم ہے۔ تو جب اقبال 'عجم' کہتے ہیں تو صرف ایران مراد نہیں ہوتا ہندوستان بھی مراد ہوتا ہے۔ تو بتانِ عجم کہہ کے یہ اور واضح کر دیا کہ ہندوستان اس میں لازماً مراد ہے کیونکہ زرتشتی روایت میں بت نہیں ہوتے۔ عجم کا مطلب ہے گونگا۔ عرب اپنے غیروں کو کہتے تھے یہ گونگے ہیں۔ اقبال کہہ رہے ہیں کہ تمدن ہو یعنی تہذیبی اُصول

ہوں،تصوف ہو یعنی باطنی سانچہ ہو، شریعت ہو یعنی قانونی سانچہ ہو، کلام ہو یعنی ذہنی اُصول ہوں، یہ سب کے سب اسلام کے جوہر سے خالی اور اسلام کے مخالف فضا میں پروان چڑھنے والے پودے ہیں۔ یہ سب کے سب خدائے عرب کی طرف پیٹھ کر کے بتانِ عجم کو پوجنے لگے ہیں۔آپ نے کمال دیکھا؟ تمدن وہ تہذیب جو ظاہر ہے۔تصوف وہ تہذیب جو باطن میں ہے یعنی آفاق کو چلانے والے اُصولِ تمدن ہیں، انفس کو قائم رکھنے والے اُصول تصوف ہیں۔اور آفاق اور انفس کے درمیان ایک ظاہری توازن اور ہمواری اور توازن پیدا کرنے والی قوت خدا کا دیا ہوا قانون یعنی شریعت ہے۔اور پھر انسانی عقل ہے جو اپنے انفس وآفاق اور خدا کو ایک اُصول کی روشنی میں مربوط رکھتی ہے۔دوسرا یہ کہ دین اخلاقی اقدار دے کر تمدن پیدا کرتا ہے۔اسی دین نے باطنی اقدار دے کر تصوف پیدا کیا تھا۔اسی دین نے شریعت دے کر قانونِ عمل پیدا کیا تھا۔اسی دین نے علم الکلام کے ذریعے حقائق کو سمجھنے کی قوت دی تھی۔تو دین کی ان تمام نعمتوں کو ہم نے عجم کے کیچڑ میں دھنسا دیا:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

تو عجم کا کام ہے صورت کو مکمل کرتے رہنا اور معانی کو مسخ کر دینا۔ یہ عجم ہے جو بہت اچھی دیوار کو رنگ دے گا لیکن اینٹوں کو دیمک کھا گئی ہے اس پر نظر نہیں کرے گا۔یعنی عجم یا عجمیت کیا ہے باطل کو حق کا روپ دینا۔خرافت کسے کہتے ہیں جو صورتاً تو حاضر ہو حقیقتاً موجود نہ ہو، وہ اظہار جس کی کوئی حقیقت نہ ہو اسے خرافات کہتے ہیں۔یعنی، بے حقیقت، بے اصل۔تو کہہ رہے ہیں حقیقت کو مسلمانوں نے اتنا زیادہ صورت کے تابع کر دیا ہے کہ حقیقت بالآخر غائب ہو گئی اور یہ اُمت روایات میں کھو گئی۔ روایات کا ایک مطلب رسوم و رواج اور دوسرا مطلب انتقالِ خبر۔یعنی کہی سنی اور روایات حدیث کو بھی کہتے ہیں۔تو کہتے ہیں کہ یہ اُمت بس سن سن کے چل رہی ہے کہ یہ ہوا، وہ ہوا، کرنے کو کچھ تیار نہیں ہے۔ روایات کا ایک اور مطلب بڑا زبردست ہے یہاں، کہ یہ اُمت لفظوں کی منتقلی تک رہ گئی۔ ان لفظوں میں جو معانی تھے ان کو فراموش کر دیا۔مفہوم و مدلول کو فراموش کر دیا:

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب!

کیونکہ سب اداکاری ہو رہی ہے،تو اداکاری جو ہے وہ دل کو لبھاتی تو ہے، دل کو دھوکے میں تو ڈال دیتی ہے مگر دل کی اصل خوراک یعنی شوق اُسے فراہم نہیں کرتی۔یعنی خطیب کا کلام مجھ سے واہ واہ تو کروا

لیتا ہے لیکن میرے دل کو بدلنے والی روشنی مجھ میں منتقل نہیں کرتا:

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

یعنی اس نے عقل کو عقیدے کے تابع کرنے کے بجائے منطق کا غلام بنا دیا۔ عقل کو عقائد سے مانوس رکھنے کے بجائے منطق کا عادی بنا دیا اور معانی کو چکھ لینے کی وجودی صلاحیت کو گنوا کر وہ لفظ کے پیچاک اور لفظ کے الجھاووں کو کھولنے کی مہارت رکھتا ہے۔ تو بس یہی سب اس کے خطاب کا اصل ہے۔ یعنی اس کا ہر لفظ دوسرے لفظ ہی تک پہنچا تا ہے۔ اس کا ہر مفروضہ دوسرے مفروضے ہی تک پہنچا تا ہے۔ منطق کیا ہے ایک مفروضے کو دوسرے مفروضے کے لیے بنیاد بنانا۔ لغت کے بکھیڑے کیا ہیں، ایک لفظ کو لینا دوسرے لفظ تک پہنچنے کے لیے ذریعہ بنا۔ تو بس یہ مفروضے اور الفاظ میں چل رہا ہے۔

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

خدمت حق کہتے ہیں حق کی بندگی کو۔ حق کی بندگی میں وہ جواں مرد تھا یعنی بندہ ہونے کے راستے میں آنے والی کسی رکاوٹ سے نہ ڈرتا تھا نہ مغلوب ہوتا تھا۔ ہر رکاوٹ پر وہ غالب آتا تھا، صوفی یعنی باعمل تھا۔ خدمت حق کا مطلب ہے بندگی کو عمل میں ڈھال لینے والا۔ جیسے خادم ہوتا ہے۔ بندہ بھی ہے اور عملاً خدمت گزار ہے۔ اور 'خدمت حق میں مرد' کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حضور بندوں کی طرح رہنے والا۔ صوفی جو تھا وہ اللہ کے حضور میں بندگی میں کمر بستہ رہتا تھا، مراقبے میں مگن نہیں رہتا تھا اور مرد آپ سمجھ گئے ہیں، مرد کا مطلب ایک تو یہ کہ جو مجاہدات پہ تیار رہے، جو کسی رکاوٹ میں مغلوب نہ ہو اور جو اپنے عہد پر قائم رہے جو خدمت سے بھاگنے کے بہانے نہ بنائے۔ ہر امتحان پہ پورا اُترے یعنی صوفی، بندگی کا عملی نمونہ تھا۔ 'محبت میں یکتا، حمیت میں فرد' اتنی گہری نفسیاتی بات اور مذہبی نفسیات کے اتنے گہرے اُصول اس ایک شعر میں بیان ہو گئے ہیں کہ کاش ہمارے اہلِ دین کو ان اُصولی اقدار کا پتا اور ذوق ہوتا۔ پورا دین بتا دیا اس شعر میں کہ بندگی، محبت اور حمیت یعنی اللہ کا بندہ بن کے عمل کرنا۔ اللہ کی محبت میں غرق رہنا اور اللہ کی وجہ سے باطل کے خلاف صاحب حمیت ہونا۔

حمیت کا باطل ہے غیرت، غیرت، محبت اور عمل، یہ پورا دین ہے۔ غیرت کس چیز کو کہتے ہیں کہ جو چیز اللہ کے خلاف ہے میں اس کا دشمن ہوں اور وہ چیز چاہے مجھ سے باہر ہو چاہے میرے اندر ہو۔ محبت یہ کہ میرا قوامِ تعلق محبت ہے۔ میرا قوام، یا مایۂ تعلق محبت ہے، وہ محبت مجھے اللہ نے اپنے تعلق کے لیے عطا

فرمائی ہے جو میرے تمام تعلقات میں کارفرما ہو۔صوفی اللہ کے تعلق کے پھل انسانی تعلقات میں لوٹاتا تھا۔ حمیت میں فرد کا مطلب ہے یکتا منفرد۔ خدمتِ حق ،محبت اور حمیت۔ان تینوں چیزوں میں ذرا سا ڈوبیے تو یہ شعر کھلتا چلا جائے گا۔اُصولی مطلب میں نے بتا دیا۔ یہ صوفی جو دین کی تمام مرادات کا مجسمہ تھا، جو رسول اللہﷺ کی پیروی کا زندہ نمونہ تھا۔ رسالت یہی تین پیغامات تو لے کرآئی ہے کہ حق کے خادم بنو، ظرفِ محبت بنو، حمیت کے مظہر بنو۔ محبت چیزوں سے قریب کرتی ہے، حمیت چیزوں سے دور کرتی ہے۔ چیزوں کے قریب ہوتا ہے تو اللہ کی بنیاد پہ ہوتا ہے، چیزوں سے دور ہوتا ہے تو اللہ کی بنیاد پہ ہوتا ہے۔اسی کو رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ الحب لله والبغض لله۔ یہ اس حدیث کا ترجمہ ہے کہ محبت ہونی چاہیے سب سے لیکن اللہ کے لیے۔ میرا ہر محبوب ذریعہ ہے اللہ کی محبوبیت کے تجربے کا۔تو محبت بھی اللہ کے لیے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے۔ یہی اقبال کہہ رہے ہیں ''محبت میں یکتا حمیت میں فرد'' تو یہ صوفی جو رسول اللہﷺ کا دینی وارث بھی تھا اور مزاجی وارث بھی تھا:

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

یہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود اور تجددِ امثال، تنزلات ستہ اور تعینات اور حضراتِ خمسہ میں کھو گیا یعنی اس نے دین کو فلسفہ بنا دیا۔عجم کے خیالات کیا ہیں دین کو فلسفہ بنانا۔عقل کو وحی پر غالب کرنا۔اس نے عجم کی پیروی میں عقل کو وحی پر غالب کر دیا۔ سالک مقامات میں کھو گیا یعنی یہ مسافر اپنے راستے کے پڑاؤ میں گم ہو گیا، منزل کو فراموش کر بیٹھا۔ سالک کا مطلب ہے مسافر، راستہ چلنے والا۔ مقام کا مطلب ہے پڑاؤ جہاں ٹھہرا جائے یعنی یہ پڑاؤ میں گم ہو گیا۔ منزل سے غافل ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ مقاماتِ سلوک تصوف کی اصطلاح ہے کہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ اس طرح کی چیزیں۔تو یہ یہ فلسفے، عجمی فلسفے کی لہر میں بتا ہوا اس نے گویا اللہ کے قرب کو اپنے وجود کا موضوع بنانے کے بجائے اپنے شعور کا ہدف بنایا۔ پوری بات یہ ہے کہ جس چیز کو وجودی حال ہونا چاہیے تھا اس نے اس چیز کو شعور میں پنپنے والے خیال بنا کے رکھ دیا:

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

یہ سب کیوں ہوا، یہ سب اس لیے ہوا کہ عشق کی آگ بجھ گئی تھی۔عشق کی آگ بجھ جانے سے باطن میں جو اندھیرا ہے وہ کائنات کی ظلمتوں پر غالب ہے، کائنات کی ظلمتوں سے زیادہ محیط ہے۔کوئی اندھیرا دل کے اندھیرے کے برابر نہیں ہوتا۔تو عشق کی آگ بجھ جانے سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور مسلمان

اس آگ سے محروم ہوکر اب راکھ کا ڈھیر ہے اور کچھ نہیں، جسے ہوائیں اُڑاتی پھر رہی ہیں۔'اندھیر ہے' بڑا اچھا استعمال کیا۔ یہ دومعنوں میں ہے: ایک تو اندھیرا ہوگیا اور اندھیر ہے کہ یہ کیا ہوگیا، یہ کیا ستم ہوگیا۔ یہ بھی ہے کہ عشق کی آگ بجھ گئی یہ کیا ستم ہوگیا اور ایک یہ کہ اندھیرا چھا گیا۔ مسلمان اس آگ کا حامل تھا، اس کے اندر یہ آگ بجھ گئی، اب وہ راکھ کا ڈھیر ہے۔

جس مرحلے پر اب ہیں وہاں ایک بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ساقی نامے کا بنیادی مضمون تاریخ اور خودی ہے۔ تو یہ ہم آگے چل کے شعر بہ شعر دیکھتے جائیں گے کہ علامہ، تاریخ اور خودی کو ایک دوسرے کے مقابل لا کے خودی کو تاریخ کا انسانی جوہر قرار دے رہے ہیں اور یہی یہ نظم ہے۔ یہ ذہن میں رکھیں۔ اس وجہ سے اس میں مابعد الطبیعیاتی مباحث کم ہیں اور اس میں تاریخ کا بیان بہت ہے۔ چند بڑے شاعر ہیں جو تاریخی بیان رکھتے ہیں جس میں فردوسی امام ہیں۔ اور فردوسی کی اس روایت میں اقبال بہت بڑا نام ہیں۔ اقبال کا ساقی نامہ تاریخ کے بیان میں اُردو کا بہترین نمونہ ہے اور اس کے بہاؤ میں ایک خاص بات ہے کہ یہ زندگی کا بہاؤ، تاریخ کا بہاؤ اور خودی کی حرکت کو آپس میں گوندھ دیا ہے، یہ ہے تاریخ کا ساقی نامہ اور پچھلا جو بند ہم نے پڑھا تھا اس کے آخری شعر میں ایک نکتہ اقبال کا تصورِ دین ہے:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یعنی آج کا مسلمان، مسلمان نہیں یہ راکھ کا ڈھیر ہے۔ کیوں، اس کو جو عشق کی آگ ودیعت کی گئی تھی اس نے اس کی حفاظت نہیں کی۔ ہمارا دین دراصل عشق کی آگ ہے۔ تو یہ اس میں ایک اچھا نکتہ ہے کہ علامہ دینِ اسلام کو عشق کی آگ کہہ رہے ہیں جو اگر روشن نہ ہو تو راکھ آپ جتنا فقہ سے، کلام سے اور رسوم سے منقش کرتے جائیں وہ دین ہے، اس دین کا مایۂ اصلی، عشق کی آگ ہے۔

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جامِ گردش میں لا ساقیا

''شرابِ کہن'' کا مطلب ہے حجازی اسلام۔ وہ شراب جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے اور جسے انھوں نے ہمارے سپرد کیا کہ اس شراب سے سرشار ہو۔

پرانی شراب مطلب ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے، جس کے ساقی رسول اللہ تھے تو جس جام میں انھوں نے وہ شراب پلائی وہی جام گردش میں لا ساقیا! کیونکہ یہ ساقی۔ تو ساقی حقیقی کا نمائندہ ہے۔ تو اس میں بڑی اہم بات ہے کہ پیغام و معنی بھی رسول اللہ ﷺ والا پیدا کرو اور صورت و قالب بھی رسول

اللہﷺ والا لاؤ۔ مقصد بھی رسول اللہﷺ والا تازہ کرو اور مقصد کے جو وسائل ہیں حصول وہ بھی وہی اخذ کرو جو آپ نے دیے ہیں۔

ساقیا کا مطلب ہے کوئی بڑی ہستی جو الوہی بھی ہوسکتی ہے اور جس کی بات واجب الاذعان ہو یہاں ساقیا کو یوں سمجھیے کہ مجھے اسی منبع فیضان سے فیض نصیب کرا اور اُسی وسیلۂ فیض کے ذریعے نصیب کر۔ اسلام روح کی جو شراب تو نے رسول اللہﷺ کو دی تھی اور جو پیالہ انھیں دیا تھا وہی سرشاری اور عشق کی آگ ہے ان دونوں کا سبب رسول اللہﷺ کی ذات ہے، بس یہ ذہن میں رہے تو سب چلتا رہے گا۔ روح کی سرشاری عشق کی آگ ہے۔ یہی ''سوز وساز'' ہے جو اقبال کی سب سے اہم اصطلاح میں سے ایک ہے۔ عشق کا سوز اور عشق کی آگ، ان دونوں کا مرکزی سبب، ان دونوں کا مرکزی مضمون رسول اللہﷺ کی ذات ہے۔ نہ عشق آپﷺ سے ہٹ کے پیدا ہوسکتا ہے نہ سرشاری آپﷺ سے منسوب ہوئے بغیر حاصل ہوسکتی ہے تو اس شعر کو اس طرح دیکھیں اگر آپ ساقیا خدا کے معانی میں لیں۔

مجھے عشق کے پَر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا

حسنِ کلام تو اس سے ہی واضح ہے۔ تو اب یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے دو چیزوں کی یعنی مسلمان کو دو چیزوں کی بنیادی ضرورت ہے ایک transcendence یعنی علویت یا بالفاظِ دگر اثباتِ حقائق علوی دوسری illumination یعنی تنویر۔ پرواز اور روشنی مسلمان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ علویت اور پرواز اپنی سطح سے بالاتر حقیقت سے تعلق عطا کرے گا اور روشنی تنویر ذات self-illumination عطا کرے گی۔

اس شعر میں کہہ یہ رہے ہیں کہ مجھے عشق کی آگ اور معرفت کی روشنی عطا فرما جو اب میری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس شعر میں ایک اور بڑا نکتہ ہے وہ بہت ضروری تھا کہ مجھے عشق کے پر اس لیے لگا کہ میں تجھ تک پہنچ سکوں اور جگنو اس لیے بنا کہ میں دوسروں کو تجھ تک پہنچا سکوں:

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

'خرد کو غلامی سے' آزاد کر کے فوری معانی یہ ہیں کہ مسلم ذہن کو مغرب کی فکری غلامی سے آزاد کر۔ لیکن خرد کی غلامی کا مطلب ہوتا ہے حواس کی غلامی۔ عقل جو ہے ناں وہ حواس کی پابند ہے تو اس کو تاریخی غلامی سے لے کر خلقی غلامی تک کے مراحل میں آزاد کر دیجیے اور یہ آزادی ایسی ہو کہ یہ جوانوں کو پیروں کا استاد بنائے۔ جوانوں کو پیروں کا استاد بنانے کا مطلب ہے کہ انسانی ذہن کا تاریخی بہاؤ یہ ہے کہ بڑا

چھوٹے کوسکھاتا ہے۔ جو پچھلی نسل میں ہے وہ اگلی نسل کوسکھاتا ہے۔ اس تاریخی بہاؤ کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں کہ بزرگ اپنی خامیاں بھی نوجوان کوسکھا دیتا ہے۔ تو اگر خرد غلامی سے آزاد ہوکر حق کی طرف ایک کیفیت حضور میں یکسو ہوگئی جو خرد کا مقصودِ اصلی ہے، نوجوان پیر کوسکھا سکتا ہے:

ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

اب یہاں یہ شعر بتا رہا ہے کہ یہ یقیناً ساقیا خدا ہے۔ کہ اس شاخِ ملت کی زندگی ہی تخمِ توحید سے ہے یعنی ملت کا پیڑ اُگا ہی تخم توحید سے ہے۔ خدا سے تعلق ہی ملت کو زندہ رکھتا ہے۔ تیرا تعلق اور تیری توجہ اس سے ہٹ جائے تو یہ ملت سوکھا ہوا پیڑ ہے اور نفس اس بدن میں تیرے دم سے ہے۔ تو نے اس میں پھونک ماری ہے۔ تو جسد اُمت زندہ ہوا ہے ورنہ یہ مٹی کا ڈھیر ہے اور اس میں دو چیزیں بہت اہم ہیں۔ نم اور دم۔ نم کا مطلب ہے کہ تو سیراب کرتا ہے، سیراب کرتا رہے اور دم کا مطلب ہے کہ تو اپنے انتہائے قرب میں اس کو زندہ رکھتا ہے۔ نم کا مطلب کہ تو دور ہے تیری دوری ملت کو زندہ کرتی ہے۔ دم کا مطلب کہ تو قریب بھی ہے اور تیرا قرب ملت کو حیات دیتا ہے۔ اس میں ذومعنویت ہے کہ اس اُمت کو تجھ سے تعلق کی ایک معجزانہ شان ملی ہے کہ تیری دوری بھی اسے پالتی پوستی ہے اور تیرا قرب تو اُسے زندہ رکھتا ہی ہے۔ نم یعنی کہ باقی دنیا یہ دور ہے اور پھونکنا یہ نزدیک ہے۔

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے

اب آپ دیکھیں کہ اس میں ایک مسنون طریقے سے دُعا کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دُعا کرتے ہوئے اللہ کی ثنا پہلے کیا کرو۔ یعنی دُعا کرنے سے پہلے اللہ کی خوشامد کیا کرو اور پھر عرض کیا کرو۔ اس میں جو بڑی ضرورت ہے وہ پہلے بتاؤ۔ اب اپنی سب سے بڑی ضرورت بتا رہے ہیں کہ تڑپتے پھڑکنے کی توفیق دے۔ مطلب یہ کہ عشق کی وہ آگ دوبارہ بیدار کرکے میرے اندر روشن کر دے۔ ''تڑپنے کی توفیق دے'' جو آگ بجھ گئی ہے اسے دوبارہ میرے اندر روشن کر دے۔ تڑپنا جدائی میں ہے، پھڑکنا حضور میں ہے۔ نم اور دم کی رعایت یہاں بالکل کھول دی ہے۔ پھڑکتا آدمی دیکھ کر ہے۔ تڑپتا آدمی جدائی میں ہے کہ مجھے آدابِ فراق اور قانونِ وصل دونوں کی انتہا پہ پہنچا دے اور اس کو مزید کہہ رہے ہیں کہ دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے۔ دل کون سا ہے وہی نور جس سے مجھے جگنو بنا کے اُڑایا ہے۔ سوز کیا ہے وہی آگ جو میرے اندر دوبارہ روشن کرنی ہے۔ دونوں اطراف کا احاطہ کرلیا۔ دل نشاط کا گھر ہے اور سوز فراق

کا جوہر ہے۔ دل وصال کی کیفیت کا محافظ ہے۔ دل کبھی غائب نہیں رہتا اور سوز جو ہے وہ فراق کے ادب کا نگران ہے۔ سوز فراق کا ادب ہے۔ دل وصال کی شان ہے۔ تو دلِ مرتضیٰؓ یعنی وہ آدابِ وصل جو علیؓ کو سکھائے تھے وہ مجھ تک منتقل کرا اور وہ آدابِ فراق جو ابوبکرؓ کو سکھائے تھے وہ بھی مجھ میں منتقل کر یہی وہ پورا دین ہے۔ پورا دین دل مرتضیٰؓ سوزِ صدیق دے۔ سوز صفت ہے وجود کی، دل مرکز ہے روح کا۔

دل تخم دانش وحکمت ہے۔ اور سوز حالِ ہستی ہے، حالِ وجود ہے۔ تو مجھے حالِ وجود میں بھی دے جو فراق کا ہے اور مجھے حال معرفت کا بھی دے جو وصال کا ہے۔ کیونکہ وصل تک رسائی ہوگی تو دل سے ہوگی، فراق سے مانوس ہوں گے تو سوز ہی سارے وجود کا مظروف ہے کہ یا اللہ مجھے وجود میں عاشق بنا اور قلب میں عارف بنا۔ آپ دیکھ لیجیے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو ظاہر ہے بہت بڑا صدمہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی کہ کسی نے اگر کہا کہ آپ ﷺ فوت ہوگئے تو میں اس کی گردن اُڑا دوں گا۔ یہ ایک شدتِ غم تھی۔ اور بھی بہت سے لوگ بے ہوش ہوگئے۔ ایک صحابیؓ نے دعا کی کہ میری بینائی چھین لے، وہ آنکھ نہیں کھولنا چاہتا۔ جس آنکھ سے رسول اللہ کو دیکھا تھا وہ نہ دیکھے۔ ان کی بینائی بھی چلی گئی اس طرح کے واقعات ہو رہے تھے، ایک ہنگامہ مچا ہوا ہوگا تو اس پر حضرت ابوبکرؓ آئے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اس وقت ایک فقرہ کہا کہ اللہ نے آپ پر دو موتیں جمع نہیں کیں۔ سب کے لیے دو موتیں ہیں آپ کے لیے نہیں۔ تو خیر اس فقرے کے بڑے معانی ہیں لیکن سوز سے یہ متعلق نہیں ہے۔ سوز میں اب آپ کو بتا رہا ہوں۔ سوز کا اظہار کہاں ہوا۔ سوز کے بعد کھڑے ہو کر کہا جو رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتا تھا وہ یہ جان لے کہ آپ ﷺ کو جانا تھا اپنے رفیق اعلیٰ کی طرف وہ تشریف لے گئے اور جو آپ ﷺ کو معبود سمجھتا تھا، خدا سمجھتا تھا وہ اپنے آپ کو درست کر لے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے جا چکے ہیں۔ تو اس پر لوگوں کو ایک دم جیسے تسکین ہوگئی، ہوش میں آ گئے۔ اب یہ فقرہ کیا تھا یہ سوز تھا۔ سوز کا مطلب ہے آدابِ فراق پہ کار بند ہونا۔ اس وقت فراق کا ادب وہ نہیں تھا جو حضرت عمرؓ سے یا کچھ اور لوگوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس وقت فراق کا ادب یہ تھا کہ آپ اپنی اگلی منزل پر پہنچ کر ہماری طرف سے فکر مند نہ رہیں۔ جیسے دلِ مرتضیٰؓ کی جو دلیل ہے۔ حضرت علیؓ کا ایک قول ہے کہ اگر میری آنکھوں پر سے تمام پردے اُٹھا بھی دیے جائیں یعنی جو میرے اور اللہ کے درمیان ہیں۔ غیب کے پردے اُٹھا بھی دیے جائیں تو میرے یقیں میں ذرا برابر اضافہ نہ ہوگا۔ تو کیا ہے یہ قلب ہے جو حالِ حضور میں رہتا ہے۔

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر

اس میں وہی تیر کا کوئی جواب نہیں ہے۔ 'وہی' تیر یعنی جو رسول اللہ ﷺ کی کمان سے نکلا تھا۔ آپ

سمجھ گئے۔ رسول اللہﷺ کی کمان سے نکلے ہوئے تیر نے مرتضیٰؓ کو دل دیا، صدیقؓ کو سوز دیا تھا۔ وہ تیر کھانے کی قابلیت علیؓ کو دی، وہی تیر کھانے کا حال ابوبکرؓ کو دے دیا۔ دل اسی لیے تو ہوتا ہے کہ اس پر تیر لگے۔ وہی تیر یعنی اپنی محبوبیت کی وہی شان ہم پر منکشف کر دے جس نے علیؓ کو دل اور ابوبکرؓ کو سوز دیا تھا۔ 'تمنا کو سینوں میں بیدار کر' کہ وہ تیر دل میں تمناؤں کو پیدا کرتا تھا آپ کیا سمجھتے ہیں کہ عشق کسے کہتے ہیں، عشق تمنا کی تسکین کو تھوڑی کہتے ہیں۔ عشق تمنا کی پیدائش کو کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا وہ جو تو نے ان کی خلقت اور فطرت میں رکھی تھی، دوسری تمنا اپنی شانِ جمال سے اُن پر منتقل کر دی تو وہ تمناؤں کا گھر بن گئے تھے۔ عشق نام ہے تمنا کا اور اس تمنا کا کہ یہ تمنا کبھی ختم نہ ہو۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

اس میں معانی مشکل نہیں ہیں۔ تشبیہ کا کمال دیکھیے۔ بات یہ ہے کہ شعر ذہن کو شامل کیے بغیر بھی واہ واہ کروا دیتا ہے، یہ اسی طرح کا شعر ہے۔ اس میں کمال کیا ہے؟ معانی تو واضح ہیں۔ اس میں کمال یہ ہے کہ زمین کا شب زندہ دار وہی حیثیت زمین کے لیے رکھتا ہے جو تارے آسمان کے لیے رکھتے ہیں۔ تارے نہ چمک رہے ہوں تو آسمان رات کی خوراک بن جائے گا اور شب زندہ دار اگر یہاں نہ ہوں تو یہاں عشق کی آگ فنا ہو جائے گی۔ یہ تشبیہ بہت اچھی ہے:

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

میں کوئی چیز اپنے تک نہیں رکھنا چاہتا۔ اقبال کا ایک نفسیاتی مسئلہ بھی تھا، ان کی پوری کوشش تھی کہ ان کا مخاطب ان سے بہتری میں چلا جائے۔ اس میں وہ بہت سچے تھے۔ مطلب انھیں اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ آپ ان سے چھوٹے رہ جائیں انھیں زیادہ دلچسپی یہ تھی کہ آپ اُن سے بڑے بن جائیں اور وہ ساری عمر اسی فکر میں رہے کہ میں اپنے سے بڑے لوگ پیدا کر دوں۔ گو کہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن بہرحال ان کی کوشش یہی رہی۔

دل عشق اور نظر کو جمع کرتا ہے۔ عشق اور نظر کا میل کیا ہے۔ اس میں یہاں 'نظر' کس معانی میں ہے دید باطن بھی اور دید عقلی بھی۔ تو کہہ رہے ہیں کہ جو میری عقل اور میری نظر اور میری فراست اور میری بصیرت ہے وہ ان کے قلب میں ڈال دے۔ میری عقل کو ان کے قلب میں ڈال دے کیونکہ میں اپنی عقل کو قلب میں ڈال کے اسے نظر بنایا ہے اور عشق تو واضح ہے۔ تو دل اسی کو کہتے ہیں جس نے عقل کو مسخر کر دیا

ہو۔ سوز اسی کو کہتے ہیں جو پورے وجود کا واحد حال ہو۔ تو کہتے ہیں میرے وجود کا واحد حال یعنی سوزِ صدیقؓ کی وراثت ہے وہ مجھ تک نہ رُکے، وہ جوانوں میں چلی جائے اور میرا عشق اور میری نظر جو قلبِ مرتضیٰؓ کی وراثت ہے میں اس کا آخری وارث نہ بنا رہوں بلکہ یہ دوسروں تک چلا جائے۔

میری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

اب اس کی خوبصورتی دیکھتے جایئے کہ میری ناؤ گرداب میں پھنسی ہوئی ہے اور اس گرداب نے اسے ایک جگہ ساکت کر دیا ہے تو اس کو دوبارہ گردش میں لے آ۔ یعنی گرداب اور ناؤ میں بڑا تعلق ہے کہ انسانی وجود اور دنیاوی وجود کا تعلق دریا اور کشتی جیسا نہ ہو تو توازن بگڑ جائے گا۔ کائنات دریا ہے اور میں اگر خود کو کشتی بنانے میں ناکام ہوں تو میں گویا موجود ہی نہیں ہوں۔ تو کہہ رہے ہیں کہ اب ایک ایسا انتشار دنیا میں پھیلا ہوا ہے کہ یہ دریا میرے لیے گرداب خلق کرتا جا رہا ہے۔ دریا میرے لیے لہروں کے بجائے بھنور بنا رہا ہے۔ میں تو کشتی ہوں، میں تو اپنے اصلِ وجود پر کھڑا ہوا ہوں لیکن اس دنیا میں ایک بگاڑ پیدا ہو گیا ہے یہ میرے لیے موافق لہریں پیدا کرنے کی بجائے اب بھنور پیدا کر رہی ہے تو چونکہ دنیا ہو یا دریا ہوں، دونوں کا نظام آپ کے ہاتھ میں ہے تو یا اللہ مجھے کشتی بنایا ہے تو اس دنیا کو بھنور پیدا کرنے سے روک دے۔ میری کشتی اس دنیا کے انتشار سے گھبرا کے ایک جگہ یہ ساکت ہو گئی ہے تو اس کو پھر اس دریا میں رواں کر دے تا کہ یہ دوسرے کنارے تک پہنچ سکے۔ ثبت ہونے والا، ساکت ہو جانا، جم جانا۔ ثابت و سیار یہ ستاروں کی قسمیں ہیں۔ پرانے زمانے کے جو ستارے ساکت ہیں انھیں ثوابت کہا جاتا ہے اور جو حرکت میں ہوں انھیں سیار کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی آپ دیکھیں کتنا کمال ہے۔ اپنے آپ کو پہلے آسمانوں، ستاروں میں شمار کیا۔ تو کہہ رہے ہیں، میں ایسا تارہ ہوں جو ٹھہر گیا ہے تو اس کو پھر سیارہ بنا دے لیکن اس میں جو ایک بڑی بات کہی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کا تاریخی نظم میرے وجودی مرتبے اور نظم سے مناسبت نہیں رکھتا، یااللہ تو اس مرتبۂ تاریخ کو مرتبۂ وجود سے ہم آہنگ کر دے کہ تاریخ کی حرکت اب مجھے ساکن کر رہی ہے تو میرے اندر وہ حرکت پیدا کر دے جو تاریخ کی اس حرکت پر حاوی ہو جائے۔

بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

اب 'مرگ و حیات' ثابت اور سیار کے فوراً بعد لے آئے۔ یعنی ایک دم ان کا اطلاق کر دیا کہ ثابت ہونا مر جانا ہے، سیار ہونا زندہ ہونا ہے کہ میری آرزو ہے کہ تو مجھے زندگی اور موت کے بھید بتا دے، اس

کے حقائق بتا دے کیونکہ تو نے ہی کائنات کو بنایا ہے تو ہی حقیقت کو جانتا ہے۔ اب اسرارِ مرگ و حیات یہاں بہت صوفیانہ اور فلسفیانہ معنوں میں نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیں کس طرح زندہ رہتی ہیں، کس طرح مرجاتی ہیں۔ مجھے یہ راز بتا دے۔

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینہ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

چند اشعار سے ایک ہی معانی کو تشکیل دینا ہے۔ یہاں یہ بتا رہے ہیں کہ دیدۂ تر کی بے خوابی۔ آدمی روتے ہوئے بیدار ہے اور دیدۂ تر کی بے خوابی بہت خوبصورت لگتا ہے۔ تو اس دیدۂ تر کی بے خوابی میں کس چیز کا فوراً ابلاغ ہوتا ہے؟ عشق اور اندیشہ کہ مجھے عشق کا حاصل نہ ہونا رُلا رہا ہے اور بے خواب رکھے ہوئے ہے مجھے کائنات کا اندیشہ۔ میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں۔ اب یہ عشق کو مکمل کر دیا ہے۔ عشق نام ہے دیدۂ تر اور دلِ بے تاب کا۔ اور دل کی بے تابیوں کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ عام دل کی بے تابیاں نہیں ہیں، ان میں سے ان کی اصل بے تابیاں ایسی ہیں جو ابھی ادراک میں نہیں آئیں۔ یعنی دل ایسی بے تابیاں بھی رکھتا ہے جو نہ ادراک میں آتی ہیں نہ احساس میں آتی ہیں۔ پوشیدہ بے تابیاں اور 'مرے نالۂ نیم شب کا نیاز'۔ یعنی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے میری دُعائیں۔ 'میری خلوت و انجمن کا گداز'۔ یا اللہ میں تنہائی میں بھی تجھ سے وہی چیز مانگتا ہوں جو انجمن میں مانگتا ہوں۔ میں ایک ہی آگ سے پگھلنے والی موم بتی ہوں چاہے اس کو طاقِ تنہائی میں رکھ دوں، چاہے اُسے صدرِ انجمن میں رکھ دو۔ تو اُمنگیں مری آرزوئیں مری اُمیدیں مری جستجوئیں مری اب یہاں جو شعر کھولنا ہے وہ یہ ہے:

میرت فطرت آئینہ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

اس شعر میں بہت کلیدی الفاظ ہیں ''فطرت آئینہ روزگار''۔ یہاں 'روزگار' کس معنی میں ہے؟ روزگار

کا مطلب ہے وقت۔ آپ کہیں سلسلۂ روز وشب یعنی وقت۔ اگر شب وروز مسجد قرطبہ کے معانی میں ہے تو ٹھیک ہے۔ تو میری فطرت کیا ہے؟ زمانِ تاریخی، واقعات وحوادث اور دنیا کو منعکس کرتی ہے۔ یہ کائنات میرے دل میں واقعاتی معنویت پاتی ہے، یہ کائنات میرے دل میں تاریخ رقم کرتی ہے۔ یہاں فطرت کسے کہا گیا ہے؟ جوہر۔ جوہر کیوں؟ فطرت، فطرت جوہر کیوں ہے، اگلا سوال یہ ہے۔ جوہر اور آئینے کو جوڑیئے کہ روزگار کو آئینہ نہ ملتا اگر میری فطرت شامل حال نہ ہوتی۔ تو روزگار اپنا انعکاس ملتا اگر میری فطرت نہ موجود ہوتی۔ ایک تو یہ ہوگیا یعنی جوہر نہ ہو تو آئینہ نرا شیشہ ہے۔ یہ اچھا نکتہ ہے لیکن بات کچھ اور بھی ہے۔ فطرت کہتے ہیں اس جوہر کو جس سے میرا وجود بھی بنا ہے اور جس سے میرا شعور بھی بنا ہے۔ یہ ہے فطرت کی جامع تعریف۔ فطرت میرے اس جوہر اصلی کو کہتے ہیں جس پر قیام ہے میرے وجود کا بھی اور میرے شعور کا بھی۔ تو کہتے ہیں میں اس جوہر کا حامل ہوں جس کا شعور ہو یا وجود ہو وہ کائنات کا آئینہ ہے، وہ وقت کا آئینہ ہے۔ وہ تاریخ کی تشکیل نو کرنے والی قوت ہے۔ آئینہ کیا کرتا ہے۔ مقابل شے کو عکس دیتا ہے کہ میں اپنی فطرت میں زمان، تاریخ اور دنیا کو معنویت اور تشکیل نو دیتا ہوں۔ ''غزالانِ افکار کا مرغزار'۔ اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ جو ہم نے کہا کہ فطرت جوہرِ وجود اور جوہرِ شعور ہے۔ اب جوہر وجود میں مَیں کائنات کا خلاصہ ہوں اور جوہرِ شعور میں افکار کا مقوم ہوں۔ روزگارِ وجودی محمول ہے افکارِ شعوری محمول ہیں۔ افکار بہت تیزی سے آتے ہیں، تیزی اور خوبصورتی سے تصورات میرے ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کائنات سے وجودی ہم آہنگی بھی پیدا کروں اور شعوری ہم آہنگی بھی پیدا کروں تو مجھے جس فطرت پہ بنایا گیا ہے وہ کائنات کا وجودی آئینہ ہے اور شعوری ظرف ہے۔ افکار ہرنوں کی طرح میرے ذہن سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ مرغزار یہاں بمعنی چراگاہ ہے۔ یہ کتنا بڑا ذہن ہوگا جو یہ کہے کہ افکار میرے ذہن سے اپنی زندگی اور اپنی نشوونما کا سامان لیتے ہیں۔ جس طرح کائنات اپنی تکمیل میری فطرت میں کرتی ہے اسی طرح افکار اپنی زندگی کا سامان میرے قلب وذہن سے کرتے ہیں۔

مرا دل، مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یہ بہت بڑا شعر ہے، بہت مکمل معانی کا شعر۔ بعض شعر جو مکمل معانی کے شعر ہوتے ہیں۔ یہ اس طرح کا شعر ہے کہ جیسے دل کے معانی مکمل کر دیے کہ دل معرکۂ زندگی کا میدان ہے اور یہاں کا منظر یہ ہے کہ ایک طرف گمانوں کے لشکر کھڑے ہوئے ہیں، دوسری طرف اکیلا یقین ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کر رہا ہے یعنی میرے دل میں یقین ایک سورما ہے، گمان ایک لشکر ہے اور گمانوں کا لشکر اس یقین کی پامردی اور ثابت قدمی کو ہلا نہیں پا رہا۔ کسی پر آدھا گھنٹہ گزر جائے تو وہ یہ حال برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کو

کہا جائے گا اعصابی شکست و ریخت۔ آپ ذرا توجہ کیجیے کہ یقین ایک ہے اور گمان بے شمار ہیں اور وہ یقین پر حملہ کر رہے ہیں۔ ذرا سا اس کو اپنے اندر کر کے دیکھیے اعصاب چیخ جائیں گے۔ علامہ کہہ رہے ہیں کہ یہ زندگی رزم گاہ ہے۔ یہ رزم گاہ باہر کے جغرافیے میں قائم نہیں بلکہ میرے دل میں ہے یعنی میرا دل زندگی کو اس کا جدلیاتی سانچہ فراہم کر رہا ہے۔ اب آپ اس کو فلسفیانہ معنوں میں لیں کہ جس طرح میری فطرت خلاصۂ کائنات ہے اسی طرح میرا قلب دائرۂ کائنات ہے یعنی میری فطرت میں کائنات اپنے حقائق سمیت مندرج ہوگئی ہے اور میرے قلب میں کائنات اپنے پھیلاؤ سمیت سمائی ہوئی ہے یا یوں کہہ لیں کہ میری فطرت میں دنیا سمائی ہوئی ہے۔ میرے قلب میں زندگی سمائی ہوئی ہے۔ حیات و کائنات دونوں ہی میری تحویل میں ہیں۔ ''رزم گاہِ حیات'' کی ترکیب دیکھیے۔ جس نے فلسفہ پڑھا ہو، علامہ کے فلسفے کو بھی جانتا ہو اور ہیگل وغیرہ کو پڑھا ہو تو وہ اس سے بہت زیادہ لطف اندوز ہوگا کہ زندگی نام ہے معرکہ آرائی، تصادم اور جدل کا۔ تو زندگی کا یہ خاص الخاص جوہر میرے قلب کی دین ہے، میرا قلب ایسا ہے تبھی زندگی کا جدلیاتی سانچہ ہے۔ زندگی میں تصادم کی تمام بنیادیں میرے قلب میں برپا یقین اور گمان کی لڑائی سے پیدا ہوئی ہیں۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

اب یہ booded humility انکسارِ خونما ہے جس میں آدمی سب کچھ رکھتے ہوئے اپنے آپ کو گرا کے پیش کرتا ہے۔ مطلب یہ انکسار مفلسوں کا انکسار نہیں ہے، شکست خوردوں کا انکسار نہیں ہے، طاقتوروں کا انکسار ہے، یہ فاتحین کا انکسار ہے۔ یا اللہ کے آگے اپنے آپ کو مکمل کر کے گرا دینے والی چیز ہے۔ یہ شعر کیا کہہ رہا ہے کہ یا اللہ میں نے سارے کمالات والے اوصاف اپنے اندر بھر لیے ہیں اور یہ اس لیے اپنے آپ کو میں نے کامل کیا ہے تاکہ میں اپنے آپ کو تیرے قدموں میں گرا دوں۔ تو جس کو سجدہ کرنا ہو اس کو پورے قد سے کھڑا ہونے کی مشق کرنی چاہیے تاکہ جتنا سر بلندی سے زمین پہ آئے گا اتنا سجدہ کامل ہے۔ بونوں کا کیا سجدہ؟ یعنی کہ متاعِ فقیر یا اللہ تیری دین پہ ہے اور جو جو تو نے انسان کو دینا چاہا وہ میرے کشکول میں ڈالا ہے۔ میں نے تجھ سے سارے کمالات چھینے نہیں ہیں بلکہ کشکول میں سمیٹے ہیں، کہ میرے کشکول میں پڑی ہوئی دولت ہی میری فقیری کی بھی تکمیل کرتی ہے اور مجھے امیر بھی بناتی ہے۔ یا اللہ میں اس دولت کا وارث ہوں جو فقر کو مکمل کرتی اور امیری کو حتمی صورت دیتی ہے۔

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

آپ ذرا غور کیجیے کہ فقر کے بغیر امیری نہ ہوتو آدمی صرف وہ جو بینک میں جمع کرواتا ہے وہی بھرے گا وہ چیک نہیں لکھے گا۔ اگر فقر کے بغیر امیری ہے تو وہ لینے اور جمع کرنے کا نام ہے اور فقر کی دی ہوئی امیری دینے اور لوٹانے کا عمل ہے۔ دنیا اتنی غلیظ جگہ ہے کہ اس کو لوٹانے کی طرف فطرت راغب ہی نہیں ہوتی۔ اس کو سمیٹے چلے جا رہے ہیں اور یہ احوال اگر میری دولت بن جائیں تو میں اس کو لوٹانے ہی میں مصروف رہوں گا۔ تو کہہ رہے ہیں یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ساہوکاروں کی امیری مجھے نہیں دی۔

تو نے مجھے جنید و بایزید کی امیری دی ہے تو وہ لوٹاتے چلے جا رہے ہیں۔ میرے قافلے میں لٹا دے اسے۔ اب قافلے کے ساتھ امیر کے معانی میں دوسری چیز بھی آ گئی۔ امیر کے معنی صرف دولت مند نہیں رہ گیا، قافلے کے ذکر سے کیا ہوا سربراہ، قائد، امیر۔ امیر یعنی امیرِ کارواں۔ تو جو لوگ میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں تو میری یہ ساری دولت ان میں لٹا دے اور مجھے ان سے پیچھے کر دے۔ لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے۔ یعنی کہ لٹا دے اور اس کا بہترین مصرف لے لے اور میرے پاس جو ایک چیز ہے وہ سب کو عطا کر دے چاہے میں امیر قافلہ سے ہٹ کر قافلے کے پیچھے ہی کیوں نہ چلا جاؤں۔ یا اللہ جس قافلے کا میں امیر بنا ہوا ہوں اس کے ہر فرد کو امیر بننے کے قابل بنا دے۔ اور یہ بے نیازی کی حد ہے کہ صرف لٹا ہی نہ دے، ٹھکانے لگا دے کہ یہ احساس بھی نہ ہو کہ یہ میری لٹائی ہوئی دولت ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیے کہ آدمی چاہ رہا ہے کہ اس کی ساری دولت سب میں تقسیم ہو جائے اور پھر اس کے ساتھ یہ فرمائش اور کر رہا ہو کہ یا اللہ پھر مجھے یہ احساس بھی نہ رہے کہ یہ جو تقسیم ہوئی یہ دولت میری ہے۔

ٹھکانے لگا رہے ہیں کہ اپنی منزل پہ جہاں تک انھیں پہنچنا تھا، پہنچ جائیں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ انسان کا کوئی وصف اس وقت تک قابل اعتبار نہیں ہے جب تک وہ اجتماعی نہ ہو جائے۔ عقل والے بہت گزرے ہیں لیکن ان کے لیے یہ اوصاف انفرادی تھے۔ میں یہ چاہ رہا ہوں کہ اس وصف کو آپ میری قیمت پہ اجتماعی بنا دیں، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ اقبال کا ہر تصور اپنا پس منظر رکھتا ہے۔ اقبال جس زمانے میں تھے اس میں انفرادیت پرستی individualism کا غلبہ تھا social sciences سماجی علوم میں بھی اور عقلی علوم میں بھی انفرادیت پرستی ایک بہت بڑی انسانی اور حقیقی قدر کے طور پر پیش کی جاتی تھی کہ ساری زندگی، ساری تگ و دو کا مطلب ہے اپنی انفرادیت کو استوار کرنا۔ اور یہ انفرادیت پرستی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ایک قوم پرستی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ بظاہر لگتا ہے کہ قوم پرستی انفرادیت پسندی کی ضد ہے، ایسا نہیں ہے۔ قوم پرستی دراصل انفرادیت پرستی کی تکمیل ہے۔ اس پس منظر میں وہ اس انفرادیت سے لڑ رہے ہیں جو انھیں بغیر کسی کاوش کے حاصل تھی۔ یعنی وہ اپنی انفرادیت سے لڑ رہے ہیں۔

یہ جو بند ہم نے پڑھا ہے اس میں ایک طرح سے یہ نظم نمو کر رہی ہے۔ کہ ہمارا مقصود یہ ہے۔ ہماری

صورتِ حال زوال کی یہ ہے اور اس زوال کی ذمہ داری ان چیزوں پر ہے اور زوال کی اس situation میں قوم کو جو رہنما درکار ہے اس کے اوصاف یہ ہونے چاہئیں کہ عشق میں کامل اور عقل میں مکمل ہو۔ تو کہتے ہیں کہ میرا عشق بھی کامل ہے، میرا عشق یہاں تک کامل ہے کہ اس کی پرواز الوہی ہے اور اس کی قوت سمجھیں جبلی ہے۔ یعنی میرا عشق قلب اور طبیعت کا مجموعہ ہے۔ تو اب بتا رہے ہیں کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے اندر اللہ کی توفیق سے وہ چیز پائی جاتی ہے جو اس قوم کو گڑھے سے نکال سکتی ہے تو اس کے لیے تمنا یہی کی کہ یا اللہ جو عشق اور جیسی عشق کی نگرانی میں کام کرنے والی عقل مجھے عطا فرمائی ہے وہ میرے قافلے یعنی میری قوم یا میری قوم کے ان لوگوں کو جو میری طرح آرزوئے انقلاب تو رکھتے ہیں، صلاحیت انقلاب نہیں رکھتے ان میں اس کو لوٹا دے اور ٹھکانے لگا دے، مطلب یہ کہ یہ اوصاف مجھ تک محدود رہیں تو کوئی فائدہ نہیں، تو یہ ٹھکانے لگ جائیں یعنی کسی کام آ جائیں، سب میں تقسیم ہو جائیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی چیز ہے کہ یہاں پہ اقبال جس عشق کو اور جس عقل کو سرمایۂ انقلاب اور بنائے کمال ٹھہرا رہے ہیں وہ عشق مابعد الطبیعی بلندیوں کے ساتھ ساتھ ایک طبیعی جذبہ بھی ہے کہ وہ عشق اللہ سے تعلق کے حق میں بھی درکار ہے اور مخلوق کے ساتھ تعلق کی بھی شرط وہی عشق ہے تو وہ عشق کیا ہے کہ اللہ کے غیب کو جذبۂ محبت سے دور نہیں رہنے دینا۔ اللہ کے غیب کو عشق کی بنیاد بناتا ہے اور مخلوق کے حضور کو اس غیب سے فراہم ہونے والی قوت سے ایک significance ایک معنویت اور ایک زندگی دیتا ہے یعنی اللہ کا غائب محض ہونا مخلوق کے ظاہر محض ہونے کی بنیاد بن جائے۔ یہ عشق ہے اور عقل جس کو یہ اپنے اندر دیکھ رہے ہیں وہ پیچھے ہم نے دیکھ لیا۔ وہ عقل ذہنی عقل نہیں ہے وہ عقل وجودی عقل ہے یعنی عقل کا مطلب ہے حقائق کو پہچاننا۔ عشق کا مطلب ہے حق کو چکھ لینا۔ تو یہ فرما رہے ہیں کہ حق کو چکھ لینے کی قوت سے حقائق کو پہچاننے کی جو صلاحیت پیدا ہوتی ہے وہ عقل ہے، تو کہہ رہے ہیں عشق اور عقل کے اس مجموعے کو جو مجھے عطا کیا گیا ہے وہ میری قوم میں بھی پھیلا دے، سب کو ودیعت کر دے۔ اب یہاں سے وہ پھر اُصول کی طرف جا رہے ہیں۔

❁...❁...❁